پاکستانی اردو غزل میں کربلا کے استعارے: تحقیق و تجزیہ

Research and Analysis on the Metaphorical Uses of Karbala in Pakistani Ghazel

Dr. Arif Hussain

Lecturer Boys Degree College Kharmang Skardu,
Email: arif28106@gmail.com

Abstract

Changes, movements, preferences, and manners occurred in Urdu literature, but Ghazel is the only type of literature that remained stable and unchanged with the passage of time. However, wording, symbols, and metaphors have been changing throughout the time in Ghazel. Urdu Ghazel does not limit to joys and griefs rather it reflects psychology, politics, sociology, and contemporary changing circumstances of the society. In addition, in classical and modern ghazel religious metaphors are equally used along with the cultural and social contexts. With reference to Pakistani Urdu Ghazel, it is narrated that after the inception of Pakistan, the newborn country had to face many challenges that caused poets to use Karbala as a metaphor in order to describe their feelings and emotions in such type of difficult situations. This article is delimited to the intellectual analysis of the metaphors related to incident of Karbala used in Pakistani Ghazel

مقدمہ:

اردو ادب کے لفظیات اور فکر واسلوب میں واقعہ کربلا کا کلیدی کردار رہا ہے۔ علم وادب سے شغف رکھنے والے اس بات سے بخوبی آشنا ہیں کہ مرثیہ، نوحہ، سلام اور منقبت کی ہیئت میں واقعہ کربلا کا بیان ہمیشہ سے ہوتا رہا اور اب شعرا کی نظریں ایک بار پھر کربلا کی طرف جا پہنچی ہیں جہاں انہوں نے کربلا اور اس سے متعلق الفاظ، کردار اور فکر کو اپنے عہد سے ملاتے ہوئے غزلیہ اشعار بھی کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ زیر نظر مقالہ پاکستان میں لکھی جانے والی نئی اور عصری غزل میں واقعہ کربلا اور اس کے متعلقات کے استعارے پر مشتمل ہے۔

سب سے پہلے ہم استعارے کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم بیان کر دیتے ہیں۔ تاکہ نقد و نظر واضح خطوط میں آگے بڑھ سکے۔ اردو لغت "(تاریخی اصولوں پر) میں رقمطراز ہیں کہ "مستعار لینا، عارضی طور پر مانگنا، بیان لفظ کا مجازی

معنی میں استعمال جبکہ حقیقی اور مجازی معنی میں تشبیہ کا علاقہ ہو، مشبہ سے مشبہ بہ مراد لینا، جیسے شیر مشبہ بہ بول کر مرد شجاع مشبہ مراد لیا جائے۔[۱]

انیس ناگی لکھتے ہیں:

استعارہ سے مراد الفاظ کی دلالت غیر وضعی ہے ہر لفظ کسی شے سے مختص ہوتا ہے جب ایک لفظ کو اس شے کے لیے استعمال کیا جائے جس کے لیے وہ اساسی طور پر وضع نہ کیا گیا ہو تو اسے استعارہ سے تعبیر کرتے ہیں۔[۲]

ہر لفظ اپنے معنی کے بیان کے لیے آئینہ بنتا ہے یعنی ہر لفظ کا ایک لغوی اور وضعی معنی معین ہے اگر لفظ اپنے عرفی اور لغوی معنی میں استعمال ہوئے بغیر، معنوی تبدیلی کے ادعا کے ساتھ سیاق و سباق یا قرینے کی روشنی میں مشابہت 'موازنہ یا تقابل کی بنا پر غیر ماوضع لہ میں استعمال ہو اسے استعارہ کہیں گے۔

کربلا محض ایک قطعہ زمین کا نام نہیں بلکہ کربلا ایک فکر، سوچ اور آئیڈیالوجی کا نام ہے۔ کربلا اسلام کی اس عملی تفسیر کا نام ہے کہ جہاں ایثار، قربانی، عشق الٰہی، شوق، شہادت، وفاداری، جذبہ حریت، حق کی سربلندی میں جان و مال کے نذرانے ایک طرف کو ہے تو دوسری جانب ظلم، بربریت، دہشت، اور باطل پروری اپنے بام عروج پر ہے۔ یعنی کربلا حق و باطل کے ابدی اور دائمی قتال کے سلسلے کا ایک انمٹ نقش کا نام ہے جہاں حق کی حقانیت میں سروں نے سر نیزہ قرآن کی تلاوت کر کے حق اور اہل حق کے سوکھتے شجر کو اپنا خون پلا کر حیات جاودانی بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ حسین نے سب کچھ لُٹا کر دین کو زندہ کیا تو خدا نے انسانوں کے دلوں میں ذکر و محبت حسین کو زندہ رکھا۔

زمانے میں بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جو رونما ہو کر زمانے کے گزرتے سیلاب میں بہہ کر اپنی یاد کھو بیٹھتے ہیں تاریخ میں ایک واقعہ ایسا زندہ و تابندہ ہے جو آگے چل کر ایثار، وفاداری، حریت فکر، اور عشق حقیقی کا استعارہ بن کر اپنے انمٹ نقش اور لازوال ہونے کا ضمیر انسانی کو احساس دلا رہا ہے 'تاریخ اسے کربلا کے نام سے جانتی ہے چنانچہ ڈاکٹر قاضی عبید الرحمن ہاشمی اپنے مضمون "سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ: ایک مطالعہ "میں لکھتے ہیں:

سانحہ کربلا سے مماثل اور بھی نہ معلوم کتنے ہی واقعات تو لرزہ خیز جو انسانی آلام ہو سکتے ہیں جو ہماری شعری روایت کا جزو بن سکتے ہیں اور بلاشبہ ہمارے تخلیقی شہ پاروں میں سانحہ کربلا کے علاوہ بھی انسانی حافظے میں محفوظ بہت سے حادثات کی سرخیوں نے ہمیشہ ہی ہماری شعریات میں اثر رسوخ کی راہیں تلاش کی ہیں لیکن اردو اور فارسی کی شعری روایت میں جس قدر حوالے اور اشارے سانحہ کربلا کی مناسبت سے مستعمل ہوتے رہے ہیں اس کی مثال، کوئی دوسرا عدیم النظیر واقعہ بھی فراہم کرنے سے قاصر ہے[۳]

ہر باضمیر اور انسانیت کی خاطر جینے والا ذہن کربلا کو بصیرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کے نرم ذہنیت کے مالک شعرا نے اپنی وسیع ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کربلا کو موضوع سخن قرار دیا اور یوں کربلا نے بھی نثر اور شعری دونوں اصناف میں اردو کو ترقی دلائی' خاص کر شعری ادب میں مرثیہ، نوحہ، منقبت اور سلام کربلا کی دین ہے۔

حسن سجاد سید اپنے مضمون "اردو شاعری میں کربلا کا استعارہ" میں لکھتے ہیں :

حضرت امام حسین علیہ السلام کی فقید المثال قربانی کی انفرادیت ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جارہا ہے، اس قربانی کی یاد دلوں میں اور محکم ہوتی جارہی ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے ادب پر بالعموم اور اسلامی زبانوں کے ادب پر بالخصوص اس واقعے کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں اور ہر دور کے لکھنے والوں نے اپنے اپنے انداز سے حضرت امام عالی مقام علیہ السلام کو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے (۴)

کلاسیکی اردو غزل میں مذہبی عناصر مثلاً لفظیات، تلمیحات، اصطلاحات اور استعارات کا استعمال بھرپور انداز میں ملتا ہے قیام پاکستان کے بعد کی غزلوں میں بھی مذہبی عناصر توانا صورت میں دکھائی دیتے ہیں کیونکہ مذہبی مقامات، شخصیات اور واقعات سے معاشرے کے اکثر طبقے کی وابستگی ہے جس کی وجہ سے شعوری اور لاشعوری طور پر مذہبی عناصر کا بیان جذباتی وفور کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ناصر کاظمی کی ایک مکمل غزل (پہلی بارش کی پہلی غزل) مذہبی واردات کو بیان کر رہی ہے۔ اسی طرح دیگر شعرا خاص کر منیر نیازی نے سلام، نعت اور غزل کی سرحدوں کو ملایا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد غزل گو شعرا کو ہجرت نے بہت متاثر کیا اور ہجرت کے بعد کی قتل و غارت، بے رحمی اور پھر نئی مملکت میں سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے ایک بے اعتمادی کی فضا قائم ہوئی جسے دور کرنے کی غرض سے مذہب اور تاریخ کا سہارا لیا گیا جن میں سے ایک واقعہ کربلا کا استعاراتی اسلوب میں بیان ہے جو کہ پاکستانی اردو غزل میں ایک رجحان کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس ضمن میں محمد بلال ملک اپنے مقالے "اردو غزل میں کربلا کے اثرات" میں لکھتے ہیں:

قیام پاکستان کے بعد غزل گو شعرا کی نظر کچھ اور قرآنی و اسلامی تلمیحات، علامات، تمثالوں اور استعاروں کی طرف بھی گئی۔ کیونکہ انہیں اپنے عصری آشوب سے مقابلہ کرنے کے لیے روحانی اور فکری توانائی کی ضرورت تھی اس لیے انہوں نے اسم اعظم، یوم عاشورہ، کربلا، حسین، عباس، حر، فتح مبین جیسی علامات و تلمیحات کو اپنی غزل میں استعمال کیا (۵)

وہ رن مجھ میں پڑا ہے خیر و شر کا
کہ اپنی ذات میں اک کربلا ہوں
(سلیم احمد)

واقعہ کربلا کو مختلف حوالوں سے پاکستانی غزل گو شعرا نے اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے سلیم احمد کے اس شعر میں انسان کے اندر نفس کے ٹکراؤ کی طرف اشارہ ہے یعنی انسان کا باطن بھی ایک کربلا ہے جہاں خیر اور شر کا معرکہ ہمیشہ رہتا ہے۔ انسا ن کی داخلی کرب کی کیفیات کے بیان کے ساتھ ساتھ سیاسی، معاشی، معاشرتی جبر اور استحصال کے بیان میں بھی کربلا کو استعمال میں لایا گیا۔

ڈاکٹر آغا سہیل اپنے ایک مضمون "واقعہ کربلا اور اردو کا شعری ادب" میں لکھتے ہیں

۱۹۴۷ء کے بعد معنوی اور باطنی زندگی کی سطح پر قدر مشترک رکھنے کے باعث سانحہ کربلا شعری تجربے کا لازمی جزو بن گیا ہے یہاں علامتی استعاروں کو صنائع بدائع کے وسیع تر تناظر میں استعمال کیا گیا ہے کیونکہ سانحہ کربلا کے واقعات میں جملہ علامات کے دیگر شعری لوازمات، علامات، استعارہ، تلمیح وغیرہ کو علیحدہ علیحدہ تشخص یا پس منظر میں استعمال کیا گیا ہے(۶)

مجید امجد کی نظموں میں کربلا اور اس کے محترم کرداروں کے بارے میں بھی منظوم کلام ہیں جیسے چہرۂ مسعود، حضرت زینب۔ ان کی غزلیں ویسے بھی تعداد کے لحاظ سے کم ہیں۔ مجید امجد کربلا کے مرکزی کردار امام حسینؑ کے آخری فرمان مبارک(رضا بقضائك و تسليما لامرك) کا غزلیہ ترجمہ کرتے ہوئے امام عالی مقام کو ان الفاظ میں سلام پیش کر رہے ہیں۔

سلام اُن پہ تہہ تیغ بھی جنہوں نے کہا
جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے
(مجید امجد)

قیام پاکستان کے بعد پاکستانی غزل گو شعراء کے ہاں اردو غزل میں وجودی فکر کے عناصر بھی نمایاں ہوئے۔ پاکستانی سیاسی و سماجی حالات شروع سے ہی گھمبیر رہے ہیں ترقی پسند شعراء نے بھی اسی فکر سے استفادہ کرتے ہوئے کربلا سے مطابقت دیتے ہوئے اور مشابہت تلاش کرتے ہوئے ایک نئے رجحان کی طرف پیش قدمی کی۔

تنہا کھڑا ہوں میں بھی سر کربلائے عصر
اور سوچتا ہوں میرے طرفدار کیا ہوئے
(محسن احسان)

شہرت بخاری ترقی پسند شعرا میں اہم مقام رکھتے ہیں جہاں ان کے ہاں انقلاب کے دیگر استعارے ہیں وہاں ان کی غزل میں کربلا اور اس کے پس منظر میں استعارے در آئے ہیں جیسے ایک اور کربلا کے آباد ہونے، اور پھر اس کربلا میں حریت کے لیے آواز بلند کرنے کے لیے صرف حسینؑ کے اُٹھنے اور پھر کوفے کی گلی آل نبی پر تنگ ہونے کی تلمیحات کو اپنے عصر

سے ہم آہنگ کر کے لطیف استعارے اخذ کیے ہیں۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں "شہرت بخاری اول و آخر ایک غزل گو شاعر ہیں۔۔اُن کی آواز ایک چوٹ کھائے ہوئے درد مند دل کی آواز ہے، جس میں سیاسی، سماجی احساس تو ہے ہی، کہیں کہیں صدیوں کی تاریخ کی گونج بھی شامل ہو گئی ہے "(۷)

آباد پھر اک کرب و بلا ہو کے رہے گی
یہ رسم بہر حال ادا ہو کے رہے گی

(شہرت بخاری)

منیر نیازی کو پاکستان کے اہم غزل گو شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ منیر نیازی کی غزل کے جہاں دیگر انفرادیت کے پہلو ہیں وہاں ان میں سے دو پہلو خاص توجہ کے طالب ہیں ایک یہ کہ ان کی غزل میں مذہب خاص کر قرآنی آیات کا ترجمہ، تراکیب اور قرآنی فقروں سے مزین غزلیں بھی ملتی ہیں تو دوسری طرف کہیں کہیں کربلا کے متعلقات کا ذکر بھی استعارے کے روپ میں بھرپور سلیقے سے ملتا ہے۔ اس ضمن میں گوپی چند نارنگ انتظار حسین کا حوالہ دیتے ہوئے منیر نیازی کی غزلوں اور نظموں کا ایک مجموعہ "دشمنوں کے درمیان شام کے بارے" میں لکھتے ہیں:

"دشمنوں کے درمیان شام" کی نظمیں اور غزلیں پڑھتے پڑھتے کبھی ان آفت زدہ شہروں کی طرف دھیان جاتا ہے، کہ جہاں کوئی خطر پسند شہزادہ رنج سفر کھینچتا جا نکلتا ہے اور خلقت کو خوف کی حالت میں دیکھ کر حیران ہوتا تھا، کبھی عذاب کی زد میں آئی ہوئی ان بستیوں کا خیال آتا ہے، جن کا ذکر قران میں آیا ہے، کبھی حضرت امام حسین کے وقت کا کوفہ نظروں میں گھومنے لگتا ہے اس کے باوجود منیر نیازی، عہد کی شاعری کرنے والوں سے زیادہ عہد کا شاعر نظر آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے عہد کے اندر رہ کر ایک آفت زدہ شہر دریافت کیا ہے۔ منیر نیازی کو عہد منیر نیازی کا کوفہ ہے پھر ہر پھر کر شہر کا ذکر بھی ایک معنی رکھتا ہے اس سے شاعر کا اپنے ارد گرد سے رشتے کا پتہ چلتا ہے (۸)

زوال عصر ہے کوفے میں اور گدا گر ہیں
کھلا نہیں ہے کوئی در باب التجا کے سوا

(منیر نیازی)

قیام پاکستان کے بعد مجید امجد اور منیر نیازی کے بعض اشعار میں کربلا واضح اور توانا استعارہ ہے لیکن ۱۹۷۰ء کے بعد جب کہ شعراء مذہبی طرز احساس کے تحت اپنے ماضی کی تہذیبی پڑتال کر رہے ہیں۔ مصطفی زیدی کے ہاں کربلا، شام غریباں جیسے استعارے اپنے عہد، عشق کے بیان اور اپنے ملکی عدم اطمینان کی فضا کو آشکار انداز میں بیان کرتے ہیں۔

نام حسینیت پہ سر کربلائے عصر

کس کا علم ہے کس کے علمدار دیکھنا
ایسی سونی تو کبھی شام غریباں بھی نہ تھی
دل بجھے جاتے ہیں، اے تیرگی صبح وطن　　(مصطفیٰ زیدی)

یوں تو کربلا کے استعارے کو پاکستانی اور ہندوستانی دونوں غزل گو اپنے تصرف میں لائے ہیں البتہ کئی شعرا ایسے بھی ہیں جن کی ساری شاعری کربلا کے گرد گھومتی ہے۔ جن کا موضوع ہی کربلا قرار پایا ہے۔ ان کی فہرست ڈاکٹر نثار ترابی دے رہے ہیں:

علامہ طالب جوہری، افتخار عارف، خاور اعجاز، عذرا وحید، نسیم تقی جعفری اور ڈاکٹر جواز جعفری کے ہاں استعارہ کربلا کو غزل کے مرکزی موضوع کی ایک ایسی سمت ملتی ہے جہاں سانحہ کربلا کے پس منظر سے ابھرنے والے کردار و واقعات کی تصویریں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں محسن نقوی کے ہاں تو استعارہ کربلا کے تناظر میں ابھرنے والا والا یہ شعری رویہ ان کے ہر غزلیہ مجموعے میں باقاعدہ ایک رجحان کی شکل میں سامنے آتا ہے(۹)

عظمیٰ منیر لکھتی ہیں:

محسن نقوی کے کلام میں کربلا کا ذکر شعوری اور لاشعوری دونوں حوالوں سے ملتا ہے اسی وجہ سے ان کے ہاں خنجر، نیزہ، برچھی، سناں، تلوار، فرات، تشنگی، مقتل، قاتل، پیاس، زنداں، دریا، خیمہ، شام غریباں جیسے استعارے اپنی بھرپور توانائی سمیت ملتے ہیں(۱۰)

قتل چھپتے تھے کس سنگ کی دیوار کے بیچ
اب تو کھلنے لگے قتل بھرے بازار کے بیچ
یہ کس نے ہم سے لہو کا خراج پھر مانگا
ابھی تو سوئے تھے مقتل کو سرخرو کر کے
(محسن نقوی)

پاکستانی اردو غزل میں نسائی اور خاص کر بلوغت کو پہنچتی صنف نسواں کے احساسات، جذبات، خیالات، اُمنگوں اور طرز تفکر کی عکاسی جس انداز میں پروین شاکر کی غزل میں استعاروں، کنایوں میں ابھر کر آئی ہے شاید اردو غزل میں کسی اور شاعرہ کے ہاں آئی ہو۔ البتہ پروین شاکر کی غزل صرف صنف نازک کے لیے خاص نہیں ہے ان کی غزل میں عصری شعور بھی واشگاف انداز میں چھلکتا ہے۔ ان کے جملہ استعاروں میں کربلا کے پس منظر میں کئی استعارے دیکھے جاسکتے ہیں ان میں

کربلا، دشت، خیمہ، شام غریباں، شہر منافق اور کوفہ جیسے استعارے اپنے عہد کو آئینے کی مانند واضح اور تاثیر کن پیرائے میں دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

نئی شاعری کا منظر نامہ پروین شاکر کے دستخط کے بغیر ادھورا ہے۔ پروین شاکر اردو کی ان خوش اظہار نئی شاعرات میں سے ہیں جن کو غزل اور نظم دونوں پر یکساں دسترس حاصل ہے پروین شاکر استعاروں کو نہایت سلیقے سے کھپاتی ہیں۔۔۔واقعہ کربلا کی درد انگیزی اور پر آشوبی سے جو ساختیے مرتب ہوتے ہیں، ان میں پروین شاکر کے شعری وجدان کا اصل ساختیہ شام غریباں کا ہے۔ کیونکہ یہ وہ سطح ہے جہاں ان کے نسائی احساس کو پوری تطبیق کا موقع ملتا ہے (۱۱)

پہروں کی تشنگی پر بھی میں ثابت قدم رہوں
دشت بلا میں روح مجھے کربلائی دے
آستیں سانپوں کی پہنیں گے گلے میں مالا
اہل کوفہ کو نئی شہر پناہی دیں گے
خوش آئے تجھے شہر منافق کی امیری
ہم لوگوں کو سچ کہنے کی عادت بھی بہت تھی
(پروین شاکر)

میر انیس نے مرثیے میں کربلا اور اس کے تعلیقات کو بھرپور انداز میں بیان کیا تو دیگر اصناف شاعری مثلاً نظم اور غزل کی طرف اقبال نے رجحان دیا لیکن واقعہ کربلا اپنے کرداروں کے ساتھ بھرپور انداز میں افتخار عارف کے ہاں جھلکتا ہے یہاں تک کہ بعض نے افتخار عارف کو کربلا کا شاعر بھی کہہ دیا۔ البتہ افتخار عارف کا مقصد واقعہ کا اظہار اور ابلاغ نہیں بلکہ وہ کربلا کے آئینے میں اپنے عصر کو دیکھتے تھے۔ افتخار عارف کے اپنے فن کے بارے میں کی ہوئی گفتگو کو سید محمود عالم گیلانی اپنے مقالے میں ان لفظوں میں لکھتے ہیں "میں نے کربلا کو واقعے کے بجائے اپنے آج کے حالات میں رویے، علامت اور استعارے کے طور پر برتنے کی کوشش کی ہے "(۱۲)

اردو غزل میں ہر اُن علامات اور استعارات کو بروئے کار لائے جاسکتے ہیں جو عام فہم اور شہرت رکھتے ہوں البتہ اردو غزل کی تاریخ میں ہر استعارے کو اپنے عہد کے تناظر میں استعمال کرنے کا چلن رہا ہے یہی وجہ ہے کہ مجازی و حقیقی حسن و عشق کے لیے لیلیٰ و مجنون، محمود و ایاز، گل و بلبل اور شمع و پروانہ کے استعارے لائے جاتے رہے ہیں۔ بعد ازاں تصوف کے لیے قطرہ، آئینہ، دریا اور ساقی جیسے استعارات لائے گئے۔ ترقی پسند شعرا نے جس طرح ادب میں ایک انقلابی

نعرہ ''ادب برائے زندگی ''بلند کیا وہاں یہ تحریک اردو غزل میں صدیوں سے برتے جانے والے الفاظ و استعارات کو نئی معنوی جہت دینے میں کامیاب ہوگئی۔یوں غزل میں صلیب جیسے استعارے تراشے گئے تو وہاں شعرا کو' خاص کر افتخار عارف کو کربلا کے گوہر پارے نصیب ہوئے۔اس بارے میں فیض احمد فیض لکھتے ہیں: جب گھر میں دار و رسن کی بات چلی تو مسیح و صلیب کے حوالے بھی آ گئے لیکن المیہ کربلا اور اس کے محترم کرداروں کا ذکر بیشتر سلام اور مرثیے تک محدود رہا

صرف اقبال کی نگہ وہاں تک پہنچی　　قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں

افتخار عارف نے گزارش احوال واقعی کیلئے اس ماخذ سے بہت اثر ازیں اور خیال افروز کام لیا ہے"[۱۳]

پس میر انیس نے برصغیر کے باسی ہوتے ہوئے کربلا کی بہترین محاوروں میں منظر نگاری اردو مرثیہ میں کی اور پھر اقبال نے اردو شاعری میں کربلا کو اور نمایاں کیا۔افتخار عارف نے کربلا کو اپنی غزلوں میں ایسے استعمال کیا کہ ان کی ساری غزل کربلا کے گرد گھومتی نظر آتی۔اگر کربلا کی اور اس کے متعلقات کے استعاروں کو استعمال میں لانے والے اہم شعرا کا انتخاب کیا جائے تو افتخار عارف کا نام نمایاں انداز میں لیا جائے گا۔کیونکہ اسی میں ان کی انفرادیت ہے۔عبدالعزیز ساحر افتخار عارف کے کربلائی استعارے پر یوں گویا ہوئے ہی "افتخار عارف نے اس زندگی بخش واقعے کو اپنی غزل کے لیے ایک استعاراتی آہنگ عطا کیا ہے۔۔۔اس کے رنگوں کی ہنر کاری سے مزین بالکل نئی اور منفرد دنیا افتخار عارف کی غزل میں بھی دکھائی دیتی ہے"[۱۴]

سپاہ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے پروردگار شب نکلا

(افتخار عارف)

اس شعر میں ''آفتاب کا سر ا'' سے مراد سر مبارک امام حسینؑ ہے۔شاعر کا ذہن پہلے شام غریباں کے واقعات میں سے المناک واقعہ کی طرف جاتا ہے جہاں ایک سر کو نیزے پر بلند ہوتے دکھائی دیتا ہے۔طارق ہاشمی لکھتے ہیں:

افتخار عارف کی غزل میں کربلا سے متعلق اشعار بالواسطہ یا بلاواسطہ بھی۔۔۔کربلا اور اس کے جاں نثاروں کو ہدیۂ استحسان پیش کرتے ہوئے افتخار عارف جب تاریخ کے تسلسل پر نظر ڈالتے ہیں تو عہد موجود کے مکروہات بھی اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔چنانچہ شاعر کے لہجے میں طنز تضحیک کا ایک بنیادی عنصرِ شعر بن جاتا ہے۔خصوصاً مصلحت اور منافقت کے رویّے بہت زیادہ تعریض کا نشانہ بنے ہیں[۱۵]

کربلا اور اس کے متعلقات کے استعارے:

قیام پاکستان کے بعد کی اردو غزل میں واقعہ کربلا کا استعمال براہ راست اور استعاراتی دونوں طرح سے ہوتا رہا۔ یہ چلن اچانک وجود میں نہیں آیا بلکہ پاکستان کے قیام کے بعد ہجرت کے مسائل، نئی زمین پر مصائب سے واسطہ، اجنبیت کا احساس، مارشل لائی خوف، سیاسی عدم استحکام، طبقاتی نظام اور دیگر کئی وجوہات کی بنا پر پاکستانی غزل گو شعرا نے، مزاحمت، مقاومت، احتجاج، بے وفائی، نارسائی وغیرہ کے لیے کربلا کو بطور استعارہ استعمال کیا۔ محمد بلال ملک لکھتے ہیں:

قیام پاکستان کے بعد اردو شاعری بالخصوص اردو غزل میں کربلا کی تعلیقات کا استعمال فوری یا ہنگامی ادبی رویے کا نتیجہ نہیں جس کے تحت تخلیق کار کسی واقعہ سے متاثر ہو کر اس پر اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کربلا اس زمانے میں ایک اجتماعی روحانی تجربہ بن گئی ہے۔ ایک ایسا روحانی تجربہ جو مذہبی بھی ہے اور تہذیبی بھی' اس کی جڑیں اجتماعی شعور اور لاشعور میں پیوست ہیں۔ (۱۶)

پاکستانی اردو غزل میں کربلا اور اس کے متعلقات کے استعارے ایک رجحان کے طور پر ۱۹۷۰ء (یعنی اردو ادب میں جدیدیت کے اثرات کے آنے کے بعد ایک رجحان کی صورت) میں در آیا۔ اس ضمن میں گوپی چند نارنگ کی کتاب ''سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ (اردو شاعری کا ایک تخلیقی رجحان)'' اپنی نوعیت کی اولین کتاب ہے۔ البتہ اس کتاب میں بعض ایسے شعراء کہ جن کے ہاں بھرپور انداز میں کربلا کا استعارہ جذباتی وفور کے ساتھ آیا ہے ان کا ذکر نہیں۔ اس ضمن میں شعرا کی بڑی فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین سیال لکھتے ہیں:

اسلامی تاریخ سے مذہبی شخصیات اور واقعات کی علامتی حیثیتوں کا بیان بھی جدید غزل میں جا بجا ملتا ہے۔ اس حوالے سے خاص اہمیت واقعہ کربلا کی ہے۔ شعرا نے حسین، کربلا، کوفہ، شام، خیمے، مشکیزہ، تیر اور دیگر علامتوں کے حوالے سے اپنے عہد کی سیاسی و سماجی صورت حال کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں۔ (۱۷)

کربلا کا استعارہ ایک تو اس عہد کی ضرورت تھی۔ جہاں ایک طرف پاکستان دشمن عناصر کی سازشیں عروج پر تھیں، پاک انڈیا کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی، مشرقی پاکستان داغ مفارقت دینے کے لیے دن گن رہا تھا، اور ملک کے اندرون میں مارشل لا کی گھٹن فضا تھی ان تمام کیفیات کا بھرپور اور پر تاثیر استعارہ کربلا اور اس کے متعلقات کا بنا اور اس بنا پر ایک بڑے رجحان کے طور کربلا بطور شعری استعارہ پوری آب و تاب کے ساتھ غزل کے افق پر نمودار ہوا۔ ڈاکٹر قاضی عبید الرحمن ہاشمی لکھتے ہیں کہ:

معرکہ کربلا جو محض ایک خون خرابہ نہیں ہے جو محض دو حریفوں کی پنجہ آزمائی بھی نہیں ہے، جو محض کوئی اتفاقی حادثہ بھی نہیں ہے بلکہ ایک عدیم النظیر شہادت حق، سیاہ راتوں میں انسانی قافلہ کی آخری شمع کو گل کر دینے کی مذموم

سعی، نقش خرد اور شرف خودی کو پیوند زمیں کر دینے کی جسارت، مستقبل کے مرئی اور غیر مرئی خوابوں کی پامالی، خوشیوں کے باغ میں آتش نشیں بگولوں کے نشیمن تعمیر کرنے کا طاغوتی منصوبہ وغیرہ سانحہ کربلا کے ایسے تمام مضمرات اور علائم ہیں جن کے توسط سے ہمارے عہد کے شاعرانہ تخیل کو ایک بہتر زبان اور پیرایہ اظہار مل جاتا ہے۔ تخلیقی سطح پر کربلا ہر عہد کی دانش وری اور عبقریت کا بنیادی مرکز ثقل رہا ہے اور اس المیے کی لازمانیت نے ہر دور کی مظلوم زندگی کو ایک منشور اور نصب العین بھی عطا کیا ہے (۱۸)

اردو غزل پاکستان کی تاریخ مرتب کرتی نظر آتی ہے، غزل جس طرح غم جاناں کے بیان میں اپنے آنسو بہاتی ہے وہاں غم دوراں اور وطن کی محبت میں بھی گریہ کناں رہتی ہے قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے اور پاکستان کے باسیوں کے حق میں غزل آہ و فغاں استعاروں اور کنایوں میں کرتی رہی ہے البتہ ان کو لوگ کم سنتے ہیں چونکہ ریا جو اس میں نہیں ہے۔ نام و نہاد جمہوریت، اور آئینی سرزمین میں بے آئینی اور خاص کر سقوط مشرقی پاکستان کے بعد غزل کو جلال آگیا اور یوں مزاحمتی رویہ اپنا کر سامراجیت، آمریت اور استحصال کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ نثار ترابی کا کہنا ہے کہ:

استعارہ کربلا کی ان فکری جہتوں نے نگار خانہ غزل کو نو بہ نو سجار کھا ہے اسی طرح مزاحمتی ادب کا مطالعہ کریں تو لگتا ہے کہ ساری مزاحمتی شعری ذخیرہ اسی ایک استعارے سے اپنے معنوی امکانات سمیٹ رہا ہے اس لیے آج کا جدید غزل گو عصری ماحول میں شامل ظلم و ستم کے سارے کرداروں کو یزید کے قابل نفرت روپ میں دکھاتا ہے۔ سانحہ کربلا عالمی سامراج، مقامی آمریت اور استحصال کے خلاف جس جدوجہد کی تحریک دیتا ہے اس کی روشنی نینوا سے پھوٹتی ہے (۱۹)

پاکستانی اردو غزل کا اگر جائزہ لیں تو پاکستانی غزل گو شعراء نے کربلا اور اس کے متعلقات سے اثر لے کر کربلا اور اس سے متعلق منفی اور مثبت دونوں کرداروں، کربلا سے متصل حالات، واقعات، مقامات و لفظیات اور اسمائے معرفہ کو استعارہ بنا کر اپنے عہد کی ترجمانی کا سہارا انہی سے لیا ہے کربلا اور اس کے متعلقات کے حوالے سے کربلا، حسینؑ، یزید، زینب، پیاس، مقتل، خیمہ، فرات، دریا، حرملہ جیسے استعارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سلیم اختر لکھتے ہیں "آج کا شاعر اور ادیب فرات، پیاس، حسین، خیمہ، شام غریباں، اور یزید جیسے الفاظ میں معانی کی کئی جہات بھر کر کل کی کربلا کو آج کا استعارہ بنا دیتا ہے (۲۰)

ا۔ لفظ کربلا بطور استعارہ:

جب استعارہ ہوں حق و باطل کے معرکے
ایسے میں لفظ فقط کربلا لکھے
(تابش دہلوی)

عام طور پر شاعری میں کوئی تاریخی واقعہ یا شخصیت کا ذکر تلمیح کی صورت میں ہوتا ہے لیکن بعض واقعات لازمانی ہو جاتے ہیں تو وہ علامت اور استعارے کی صورت لے کر شاعری میں اپنی بازیافت کے ساتھ نکھر کر سامنے آتے ہیں ان میں سے ایک واقعۂ کربلا بھی ہے۔ کربلا جیسا کہ لفظ سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں بلا اور کرب یکجا ہو جائے تو کربلا وجود میں آتی ہے یوں تو یہ صلیب کی مانند ایک لفظ ہے لیکن اس کے اندر معنیات کی کئی پرتیں موجزن ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر نثار ترابی لکھتے ہیں:

لفظ کربلا کی ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کا کمال ہے کہ یہ لفظ اردو کی عہد بہ عہد روایت میں جدا معنوی انداز میں استعمال ہوا مگر اس کی مجموعی فضا وہی رہی جو اس سے تاریخی صداقت کے طور پر منسوب ہے مثلاً کشت وخوں کی جگہ، شوق جانثاری کے اظہار کی جگہ، بے گناہوں کے قتل کا مقام، ظلم وجور کی جگہ، پیاس اور کرب کا انتہائی مقام، بلا اور مصیبت کی زمین، وفا و اعتبار کی آخری منزل حق و صداقت کی علامت، پیاس سے شہید ہونے والوں کی زمین، اور شر کی دائمی شکست کا مقام وغیرہ۔ جدید اور نئی غزل میں کربلا کا استعارہ جس قدر بھی معنوی حوالوں سے آئے ان میں کسی نہ کسی صورت میں معنوی جہتوں میں سے کسی ایک جہت کا عکس ضرور ابھرتا ہے (۲۱)

کربلا کے مجرد لفظ اور تراکیب مثلاً کربلائے عصر' دونوں کو استعارہ بنا کر شعرا نے نئے معانی کے کئی در وا کئے ہیں اس ایک یا مرکب الفاظ کو مختلف زاویوں سے پرکھا کرنت نئے مطالب اور روح عصر کے بیان کے لئے شفاف آئینے کا درجہ دے کر کربلا اور کربلائی کرداروں کو زندہ کیا اور یوں پاکستان کی سیاسی، سماجی اور ایمانی و اخلاقی رویوں کو کربلا سے اتصال دے پاکستان کی کربلا جیسی فضا کی تاریخ مرتب کر کے لمحہ فکریہ بھی دیا ہے۔

اس اجمال کی تفسیر کچھ اس طرح سے ہے کہ قیام پاکستان کا مقصد ایک آزاد حیثیت سے اسلامی نظام کا نفاذ کر کے اسلامی عقائد و معارف کے حصول و ابلاغ اور طوق غلامی کے دھبے کو اپنے سے دور کر کے ایک آزاد ریاست کا حصول تھا لیکن بد قسمتی سے عالمی استکبار، استعمار، استثمار اور اپنوں کی بے وفائی اور عاقبت نااندیش مقتدر طبقوں کے نازیبا کرتوتوں کی وجہ سے پاکستان سے وابستہ تمنائیں ادھوری رہ گئیں یوں پہلے پہل فلسفے کی ابحاث ادب میں داخل ہوئیں اور اردو ادب میں بھی یہ فضا اجاگر ہوئی۔ اس کی تائید میں اردو غزل میں وجودی عناصر کی موجودگی اہم حوالہ ہے کیونکہ اردو غزل اب خارج سے درون کی طرف محو سفر تھی تو من و عن تو قبول نہیں کیا البتہ استعارات کی شکل میں وجودیت کی عکاسی کی گئی۔ انہی احساس تنہائی، کرب، حبس اور پاکستان کے دایاں بازو کے قلم ہونے کی ترتیبی تاریخ کربلا کے استعارے سے مرتب کی ہے۔

وہ رن مجھ میں پڑا خیر و شر کا
کہ اپنی ذات میں اک کربلا ہوں
(سلیم احمد)

تنہا کھڑا ہوں میں بھی سر کربلائے عصر
اور سوچتا ہوں میرے طرفدار کیا ہوئے
(محسن احسان)

گھر سے نکلو تو علم بھی ساتھ رکھنا
علم بھی رکھو کربلا بھی آئے گا
(خیرہ شمیم)

کربلاؤں کے عوض انکی حکومت قائم
میرے شاہوں کے طریقے بھی یزیدوں جیسے

بجھا ہے رنگ دل اور خواب ہستی کربلا ہے
کہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں، یہ کیسی کربلا ہے
(ظفر اقبال)

مندرجہ بالا اشعار میں کڑے وقت آنے کی خاطر علم ساتھ رکھنے، نیکوکار کا لبادہ اوڑھ کر منافقانہ رویوں، اپنے وطن میں بے وطن ہونے، اور اپنے اندرون میں متضاد خیالات و کیفیات کی بھرمار اور ہر ایک جاننے والے کے ہمراہ ہوتے ہوئے احساس تنہائی کے بیان میں کربلا کو بطور استعارہ لا کر شعر میں ایک طرح کی ایجاز اور تاثیر لائی گئی ہے۔ مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کو کربلا سے ہو کر شام تک کے سفر کو باہم ملاتے ہوئے عبید اللہ علیم نے یوں تصویر کھینچی ہے۔

اس واقعہ نے دیکھ لیے کربلا کے دن
اب رہ گیا شام کا بازار دیکھنا
(عبید اللہ علیم)

دشت وفا سے آج بھی اٹھتی ہیں آندھیاں
مدت ہوئی کہ سانحہ کربلا ہوا
(رشید نثار)

پاکستانی غزل گو نے پاکستان کے مفاد پرست حکمرانوں کے خلاف پابند سلاسل ہونے کے خوف اور خود غزل کی فطری اپج کو برقرار رکھتے ہوئے ہر ظالم کے خلاف آواز اٹھائی اور ہر فورم پر یزیدی فکر کے ناسور کے پھیلنے کا خدشے کو استعاراتی پیرائے میں بیان کیے ہیں۔

اب سر کٹا یا سر تسلیم خم کرو
اس کربلائے وقت میں سردار ہے یزید
(جاوید اقبال قزلباش)

وہ معرکہ کرب وبلا ختم کب ہوا
اب بھی ان سے برسرپیکار ہے یزید
آباد پھر اک کرب وبلا ہو کے رہے گی
یہ رسم بہر حال ادا ہو کے رہے گی
ہم پھر سر فرات سخن تشنہ کام ہیں
درپیش ہم کو پھر سفر کربلا ہوا
(فارغ بخاری)

ب۔ حسینؑ اور یزید بطور استعارہ:

حسینؑ نواسہ رسول، جگر گوشۂ بتول اور سردار جوانان جنت کے دو سرداروں میں سے ایک ہیں۔ حسینؑ نے کسی مال وزر کی لالچ میں یا فساد پھیلانے یا حکومت واقتدار کے حصول کے لیے قیام نہیں فرمایا بلکہ سیرت النبیؐ کو زندہ کرنے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے (مثلي لا يبايع مثلة فرما کر یزید کی بیعت سے انکار کر کے) قیام فرمایا۔ مدینہ سے مکہ پھر کربلا سے شہید ہونے تک کے درمیان میں حسینؑ کے عزم اور ارادے میں تبدیلی نہیں آئی البتہ حق کا ساتھ دینے میں بے وفا لوگوں کے ارادے تبدیل ہوتے رہے شاعر اسی بات کو ان الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔

ایمان کو ایک بار بھی جنبش نہیں ہوئی
سو بار کوفیوں کے قدم ڈگمگا گئے

اس مقالے میں کربلا کی تاریخ لکھنا مقصد نہیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس واقعہ سے اثر لے کر شعراء نے استعارے کیسے اخذ کیے ہیں اور ان کا کیا معنی لیا ہے یا ہو سکتا ہے۔ ان استعاروں میں سے ایک لفظ حسین کا استعارہ ہے جو آزادی، حریت

فکر، خیر وغیرہ کا استعارہ ہے جبکہ یزید ظلم، بربریت، ناانصافی اور دہشت کا استعارہ ہے اس بارے میں ڈاکٹر نثار ترابی اپنے ایک مضمون "اردو غزل اور استعارۂ کربلا" میں ڈاکٹر رشید امجد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

خاص طور پر بیسویں صدی کے نصف کے بعد ہمارے یہاں سیاسی ابتلا کے جتنے زمانے آئے ان میں شعراء کو اور ادباء کو اپنا اظہار خیال کرنے میں واقعہ کربلا نے بہت مدد دی چنانچہ یزید اب ان معنی میں یزید نہیں رہا جن معنی میں یزید تھا بلکہ یزید آمریت کی ایک علامت بن چکا ہے۔ دنیا میں جہاں ظلم و ناانصافی ہوتی ہے وہاں یزید ان علامات میں سامنے آتا ہے اور حسین آزادی اور آزادی کے لیے لڑنے والوں کی آواز بن گیا ہے (۲۲)

کربلا ایسی ایک علامت ہے جس سے مزید استعارے اور علامتیں وضع ہوئی ہیں ۔۔۔اس کے دو مرکزی کرداروں امام عالی مقام اور یزید کو حوالہ بناتے ہوئے اسے سیاسی اور مزاحمتی وسیلے سے بھی اظہار کی سطح پر لایا جاتا ہے اور حبس زدہ جبر کے دور میں امام حسین اور یزید کی گفتگو کہیں علامتی اسلوب میں تو کہیں براہ است اظہار سامنے لاتی ہے ایک مظلومیت اور دوسرے کو آمریت کی علامت بنا کر پیش کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ غزل کے مضامین میں کربلائی کردار کی گونج نمایاں ہو جاتی اور غزل کربلائی استعارے میں ایک واضح کرب اور درد کی نمائندہ بن کر عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

صعوبتوں کے سفر میں ہے کاروان حسین
یزید چین سے مسند نشیں آج بھی ہے
(جالب)

کسے حسین کہوں اور کس کو شمر گردانوں
لہولہاں ہیں سب شہر کربلا کی طرح
(محسن احسان)

جہاں یزید بہت ہوں، حسین اکیلا ہو
تو کیوں نہ اپنی زمین کو بھی کربلا لکھوں
(فراز)

وہ معرکہ کرب و بلا ختم کب ہوا
اب بھی ان سے برسرپیکار ہے یزید

ج۔ فرات بطور استعارہ:

واقعہ کربلا کو صرف شیعہ غزل گو شعرا نے شعری وسیلے کے طور پر اخذ نہیں کیا بلکہ جس طرح ہر حریت و آزادی کے حصول کے لیے وسیع الظرف انسان انقلابی قدم اُٹھاتا ہے تو کربلا سے یقیناً درس لیتا ہے اسی طرح ہر نرم ذہنیت کے حامل، انسان دوست اور حریت کا احساس رکھنے والا غزل گو شاعر کربلا کو فراموش نہیں کر سکتا۔ یہیں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کربلا اور اس کے متعلقات کے استعارے آفاقی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ کربلا کی تعلیقات میں ایک بڑا نام فرات کا آتا ہے فرات نارسائی کا استعارہ ہے یعنی فرات کربلا میں بہتا ہے لیکن کربلا والوں تک رسائی نہ تھی۔ اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے غزل گو شعرا نے فرات کو بطور استعارہ اخذ کیا ہے۔ نذیر قیصر مذہبی اعتبار سے ایک مسیحی مسلک سے وابستہ ہیں۔ لیکن اردو غزل میں کربلا کا کثرت سے ذکر یا اُن کا امام علیہ السلام سے دلی لگاؤ ہے، جس کی بنا پر وہ کربلا کے پس منظر سے استعارے اخذ کرتے ہیں کیونکہ ہر انسان حق پسند اور مظلوم کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتا ہے اور دوسری بات کہ شاید انہیں حسینؑ اور حضرت عیسیٰؑ میں ایک چیز مشترک نظر آئی وہ یہ کہ ان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ سچائی کے لیے صلیب تک جا پہنچے اور حسینؑ حق کی آبیاری کے لیے نوک نیزہ پر بلند ہوئے۔ نذیر قیصر کے جملہ استعارات میں سے ایک فرات کا استعارہ ہے۔

بہہ رہا ہے فرات صدیوں سے
پانی مہنگا ہے خون سستا ہے
(نذیر قیصر)

یہ حسن اتفاق ہے یا حسن اہتمام
ہے جس جگہ فرات وہیں کربلا بھی ہے
(اقبال عظیم)

مذکورہ اشعار میں فرات اور کربلا بطور استعارہ استعمال ہوئے ہیں۔ ظاہری طور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں دو الفاظ ہیں لیکن ان کو کھولیں گے تو تاریخ کے کئی باب کھل سکتے ہیں۔ ان اشعار میں بیک وقت تاریخ بھی ہے تاریخ کی بازیافت بھی ہے اور شاعر کے اپنے عہد کا مرثیہ بھی ہے اور یہ غزل کہ خصوصیت ہے کہ وہ ان تمام کو اپنے تنگ دامنی میں پرو دیتی ہے۔ اس اجمال کی تفسیر کچھ اس طرح سے ہے کہ اول الذکر میں شاعر کا تخیل کربلا میں موجود نہر فرات پر گیا ہے اور وہاں پر خون کو بے دریغ بہاتے نظر آتے ہیں اس کے مقابلے میں نہر فرات کا پانی اپنی کثرت کے باوجود پینے کو میسر نہیں۔ اسی منظر نامے کو نذیر قیصر استعاراتی انداز میں بیان کر رہے ہیں کہ اس زمانے میں بھی اختیارات رکھنے کے باوجود بھی ناجائز ذرائع کے

استعمال سے بنیادی حقوق پائمال ہوتے جارہے ہیں۔ دوسرے شعر میں اقبال عظیم اپنے دور میں طاغوتی نظام کے خلاف احتجاج کو بیان کر رہے ہیں کہ یہ حسن اتفاق ہے کہ حسن اہتمام جہاں عوام کی کوئی رسائی نہ ہونے کے ساتھ ساتھ عوام کو مصیبتوں نے گھیر رکھا ہے۔ سید وحید ہاشمی کی غزل کے بارے میں عباس رضا لکھتے ہیں:

ہاشمی کی غزل گہری حساسیت لیے ہوئے ہیں وہ معاشرے کے دوہرے رویوں پر طنز کرتے ہیں ان کے خیال میں سماج کے قول و فعل کا تضاد تمام معاشرتی المیوں کی بنیاد ہے ایک ایسا معاشرہ جہاں مظلوم کی دادرسی کرنے والا کوئی نہ ہو اور ظلم کے مہیب سائے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہوں، وہاں کربلا 'حق گوئی' سرفروشی' اور انسانی وقار کا استعارہ بن کر ابھرتی ہے۔۔۔ ان کے یہاں انقلاب کی خواہش 'مٹتی اقدار کی بقا کا خواب، مظلومیت کی دادرسی، باطل کے سامنے سرنگوں ہونے کی بجائے سینہ سپر ہو جانے کا اعلان کربلا کی دین ہے (۲۳)

احساس کے زوال کی تاریخ کیا پڑھوں
انسان تشنہ لب ہے، زمانہ فرات ہے
(سید وحید ہاشمی)

نظر میں رکھتے ہیں عصر بلند بامی مہر
فرات جبر کے ہر تشنہ لب سے واقف ہے
(افتخار عارف)

سر فرات لکھی تھی جو پیاس زندہ ہے
وہی ہے امت مرحوم کی حیات کا جام
(علی اکبر عباس)

فرات کے علاوہ کربلا کے استعاروں میں حرملہ، ردا، تشنہ لب، دریا اور شام غریباں وغیرہ بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

ہر حرملہ کے دوش پر ترکش کو دیکھ کر
ماؤں نے اپنی گود میں بچے چھپا دیے
(سید سبط علی صبا)

اڑا کر لے گئیں اُن موسموں میں
ہوائیں نے نواؤں کی ردا تک
(فراز)

دشت بے محبت میں تشنہ لب یہ کہتے ہیں
سارے شہسواروں میں کون اب کے سر دے گا
بادبے جہت اب کے سارے گھر اجاڑے گی
کن کے سر قلم ہونگے کون نقد سر دے گا

(کشور ناہید)

کربلا کا تذکرہ اردو شاعری میں عمومی سطح پر ملتا ہے اردو غزل میں کربلا کا براہ راست اور استعاراتی پیرائے میں بیان در آیا ہے۔ پاکستانی اردو غزل میں کربلا اور اس کے تعلیقات کا استعمال ایک رجحان کے طور پر ہوا۔ برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل، ہجرت اور انتقال آبادی کے دوران ہونے والے بہیمانہ واقعات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مایوسی کی فضا کے بیان کے لیے غزل گو شعرا نے کربلا کا سہارا لیا۔ پاکستان میں سیاسی نظام کچھ ابتر صورت میں رہا یہی وجہ ہے کہ عوام نے کئی سال مارشل لاء کے سائے میں زندگی بسر کی جہاں اظہار کی آزادی نہیں تھی۔ مارشل لاء کے ادوار میں کربلا کی علامت کو ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے بھی شاعری میں استعمال کیا۔ عبید اللہ علیم فن اور شخصیت میں طلعت خورشید رقمطراز ہیں "عبید اللہ علیم نے اپنے معاشرے کا جی داری سے مقابلہ کیا اور مزاحمتی عنصر کو شاعری میں استعمال کیا انہوں نے آمریت کے دنوں مزاحمتی ادب بھی تخلیق کیا مگر بہت سلیقے سے

اس قافلے نے دیکھ لیا کربلا کا دن
اب رہ گیا ہے شام کا بازار دیکھنا

(عبید اللہ علیم)

اسی زمین میں سودا سے لے کر فیض اور مرحوم مصطفی زیدی تک سبھی نے غزلیں لکھیں مگر کربلا کے پس منظر میں ان کا یہ شعر ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے "[۴۴] آج کل کا انسان جہاں دہشت گردی، ٹارگٹ کلنگ جیسی لعنتوں کا شکار ہیں تو دوسری جانب پیچیدہ داخلی کیفیات سے دوچار بھی ہے۔ ان پیچیدہ کیفیات کے اظہار میں کربلا اور اس کے متعلقات کے استعارے بہترین پیرایہ اظہار ٹھہرے ہیں۔ آج کی غزل میں خیمہ، تعزیہ، صحرا، پیاس، دریا، زندان، اسیری جیسے لفظیات انسان کی داخلی کرب کی تصویر کشی کر رہے ہیں۔

خیمہ نہ کوئی میرے مسافر کے جلائے
زخمی تھا بہت پاؤں مسافت بھی بہت تھی

(پروین شاکر)

تعزیہ غم کا اٹھائے ہوئے گھر سے نکلے
یوں مکینوں نے کیا اپنے مکان کا نوحہ
(حسن عسکری کاظمی)

۲۰۰۰ء کے بعد دہشت گردی اور ٹارگٹ کلنگ اپنے عروج کو پہنچا ان کا ایک سبب نام نہاد اور اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کو بدنام کرنے والے زر خرید ملاں کے فتاوے ہیں جنہوں نے اسلام دشمن عناصر کی سازشوں کا ادراک کیے بغیر ہوا میں چھوڑ دیئے جس سے ناحق پرندوں کا جسم نازنین لہو میں تر ہو گیا ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جہاں سے حق کی آواز نے گونجنی تھی وہ سارے املاک بھی فقیہ شہر کی جاگیر ہے جس کی برکت سے مقہور و مجبور عوام اپنی ہی ذات کے محراب میں بے خبر اور بے خطا جل رہی ہے۔

ہیں تیرے منبر و محراب تخت و تاج یزید
نظام فتوی گری غاصبوں سے چلتا ہے

مجموعی جائزہ:

معانی کا وجود پہلے ہے یا الفاظ کا اس کا جواب دینا مقصد نہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ ہر لفظ اپنے خاص معنی میں ظہور رکھتا ہے مثلا اسد کہ جسے چیڑ پھاڑ کرنے والا درندہ یعنی شیر کے لیے وضع کیا گیا ہے، اب اسد کو حرف تشبیہ کے ساتھ اپنے سے غیر کے معنی میں استعمال کرے تو یہ تشبیہ ہے اور اگر جہاں حرف تشبیہ مذکور نہ ہو اور لفظ حقیقی معنی سے آگے جا کر مجاز کی حدوں کو چھو جائے اور قرینہ سے معنی کا تعین ہو جائے اسے استعارہ کہیں گے جیسے میر انیس کا یہ مصرعہ قرینہ کی بنیاد پر معنی کی تعیین کر رہا ہے۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

پاکستانی اردو غزل کی شناخت کا اپنا ذوق وذائقہ اور رنگ و آہنگ ہے۔ قیام پاکستان کے فوری بعد کی پاکستانی غزل ہجرت، اداسی اور تنہائی کے گرداگرد گھوم رہی ہے۔ ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے ذائقے کو چکھنے کے بعد پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کے نعرے بلند ہوئے۔ البتہ ان دونوں کو بھی خاطر خواہ قبولیت عام حاصل نہیں ہوئی۔ اسلامی واقعات وسانحات میں ایک انمٹ واقعہ کربلا کا ہے۔ غزل کے صحرا میں جہاں عشق، محبت، الم، دکھ، درد، اداسی اور تنہائی کا سماں ہے وہاں دشت نینوا میں بھی عشق، ایثار، قربانی، پیاس، غربت، کرب اور بے وفائی اپنے عروج کو چھو رہی ہے۔ گو کہ اردو غزل اور کربلا میں ایک گونا مشابہت ہے۔ کلاسیکل اردو غزل میں کربلا اور اس کے محترم کرداروں کا بیان خال خال نظر آتا ہے باقاعدہ استعارے کے روپ میں محمد علی جوہر اور خاص کر علامہ اقبال نے استعمال کیا۔

قیام پاکستان کے بعد کے پاکستانی شعرا میں ناصر شہزاد، محسن نقوی اور افتخار عارف کے ہاں کثرت سے آئے ہیں۔ اس مرحلے پر افتخار عارف کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ جس طرح میر انیس نے اردو مرثیہ میں واقعہ کربلا کو اجاگر کیا اسی طرح اردو غزل میں افتخار عارف، محسن نقوی و دیگر غزل گو شعراء نے کربلا کی بازیافت کی ہے۔

حسین، کربلا، فرات، دشت، لہو، شام، دمشق، ردا، مقتل، پیاس، صحرا، خون، یزید وغیرہ کے استعارے 'پاکستانی اردو غزل میں کربلا اور اس کے متعلقات میں بھرپور انداز میں ابھر آئے ہیں۔ جن میں پاکستانی سیاست، سماج اور اجتماعی سوچ کے ساتھ فرد کی باطنی کیفیات کی عکاسی بھی نظر آتی ہیں۔

حوالہ جات

(۱)۔ اردو لغت (تاریخی اصولوں پر) جلد اول، ترقی اردو بورڈ، کراچی، ص ۲۵۲

(۲)۔ انیس ناگی، شعری لسانیات، کتابیات، لاہور، طبع اول، مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۱۴

(۳)۔ قاضی عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، ''سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ۔ ایک مطالعہ'' قومی زبان، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، جلد ۵۹، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۸۸ط ء، ص ۷۰

(۴)۔ حسن سجاد سید، اردو شاعری میں کربلا کا استعارہ، مشمولہ: تجدید نو، جلد ۳، شمارہ ۸۔۹، اگست ۱۹۹۱ء، لاہور، ص ۴

(۵)۔ محمد بلال ملک، اردو غزل پر واقعۂ کربلا کے اثرات تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ ایم فل اردو، اوپن یونیورسٹی، شعبہ اردو، ۲۰۱۴ء، ص ۹۱

(۶)۔ عظمیٰ منیر، محسن نقوی کی شاعری میں واقعہ کربلا بطور شعری استعارہ، شعبہ اردو اورینٹل کالج، جامعہ پنجاب، ۲۰۰۶، ۲۰۰۴، ص ۹۲

(۷)۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ اردو شاعری کا ایک تخلیقی رجحان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۸۶

(۸)۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ اردو شاعری کا ایک تخلیقی رجحان، ص ۵۶

(۹)۔ نثار ترابی، ڈاکٹر، ''اردو غزل اور استعارۂ کربلا''، مشمولہ: پیغام آشنا، شمارہ ۵۵، اکتوبر تا ستمبر، ثقافتی قونصلیٹ ایران، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۲۸

(۱۰)۔ عظمیٰ منیر، محسن نقوی کی شاعری میں واقعہ کربلا بطور شعری استعارہ، شعبہ اردو اورینٹل کالج، جامعہ پنجاب، ۲۰۰۶، ۲۰۰۴ء، ص ۹۲

(۱۱)۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ اردو شاعری کا ایک تخلیقی رجحان، ص ۹۲

(۱۲)۔ سید محمود عالم گیلانی، دینی روایات اور افتخار عارف کی شاعری، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۰، ص ۲۰۲، ۲۰۱
(۱۳)۔ شیما مجید مرتب، جواز افتخار، افتخار عارف فن و شخصیت،، نواب سنز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۵، ص ۲۴
(۱۴)۔۔ عبد العزیز ساحر، افتخار عارف: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، ۲۰۰۹، ص ۷۴، ۷۳
(۱۵)۔ طارق ہاشمی، اردو غزل۔ نئی تشکیل،، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اشاعت اول، ۲۰۰۸ء
(۱۶)۔ محمد بلال ملک، اردو غزل پر واقعۂ کربلا کے اثرات تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۱۶
(۱۷)۔ عابد سیال۔ ڈاکٹر، بیسویں صدی کی ااردو غزل پر ادبی تحریکوں کے اثرات، ۲۰۱۰، نمل، اسلام آباد، پی ایچ ڈی مقالہ، ص ۳۹۶
(۱۸)۔ قاضی عبد والرحمٰن، ڈاکٹر، ''سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ۔ ایک مطالعہ'' قومی زبان قومی زبان، کراچی، جلد ۵۹، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۸۸ء، ص ۷۱، ۷۰
(۱۹)۔ نثار ترابی، ڈاکٹر ''اردو غزل اور استعارۂ کربلا''، مشمولہ: *پیغام آشنا*، ص ۳۰
(۲۰)۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، مجموعہ سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶، ص ۶۳۳
(۲۱)۔ نثار ترابی، ڈاکٹر ''اردو غزل اور استعارۂ کربلا''، مشمولہ: *پیغام آشنا*، ص ۲۵
(۲۲)۔ نثار ترابی، ڈاکٹر ''اردو غزل اور استعارۂ کربلا''، مشمولہ: *پیغام آشنا*، ص ۲۲
(۲۳)۔ عباس رضا، وحید عصر (سید وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت اور فن)، الحسن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء
(۲۴)۔ طلعت خورشید، عبید اللہ علیم، شخصیت اور فن، ایم فل مقالہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، شعبۂ اردو، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۱۲